حجیّت حدیث

تالیف

مولانا صفی الرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ

نظرثانی

شفیق الرحمن ضیاء اللہ مدنی

ناشر

مکتب تعاونی برائے دعوت وتوعیۃ الجالیات ربوہ
ریاض – مملکت سعودی عرب

islamhouse.com

ہفت روزہ اہل حدیث کراچی شمارہ نمبر ۵

حجیت حدیث مولانا صفی الرحمن مبارک پوریؒ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انکار حدیث حق یا باطل؟ (حصہ اول)

کیا قرآن میں سب کچھ ہے اور حدیث کی ضرورت نہیں؟

انکار حدیث کیلئے سب سے اہم اور بنیادی نکتہ یہ تلاش کیا گیا ہے کہ قرآن مجید میں ہر مسئلہ کی تفصیل کر دی گئی ہے۔ اس لئے حدیث کی ضرورت نہیں۔ اس کے ثبوت میں قرآن مجید کے متعلق ﴿ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ﴾ سورۃ النحل(۸۹) اور ﴿ وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ﴾ سورۃ الأنعام (۱۵٤) والی آیات پیش کی جاتی ہیں۔ جن کا مطلب توڑ مروڑ کر غلط ملط بیان کر کے یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ قرآن میں ہر مسئلہ کی تفصیل موجود ہے۔

منکرین حدیث اب ہمارا سوال سنیں، قرآن میں مردہ، خون، سور کا گوشت اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور حرام قرار دیا گیا ہے اور ﴿ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ ﴾ سورۃ المائدۃ (۱) حلال کیا گیا ہے۔ بہیمۃ الانعام کی تفسیر قرآن میں ان جانوروں سے کی گئی ہے۔ اونٹنی، اونٹ، گائے، بیل، بکری، بکرا، بھیڑ اور مینڈھا،

لغت میں بھی (بہیمۃ الانعام) کی فہرست میں یہی جانور بتائے گئے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کے علاوہ دنیا کے بقیہ جانور حلال ہیں یا حرام؟ مثلاً کتا، بلی، گیدڑ، بھیڑیا، چیتا، شیر، تیندوا، بندر، ریچھ، ہرن، چیتل، سانبھر، بارہ سنگھا، بھینسا، خرگوش، کوا، چیل، باز، شکرہ، کبوتر، مینا، فاختہ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سارے جانور حلال ہیں یا حرام؟ یا ان میں سے کچھ حلال ہیں اور کچھ حرام؟

آپ جو جواب بھی دیں اس کا ثبوت قرآن سے پیش کریں۔ آپ کی عقلی تک بندیاں نہیں مانی جائیں گی، یعنی آپ چونکہ دعویدار ہیں کہ ہر مسئلہ قرآن میں موجود ہے اس لئے ان جانوروں میں سے جس کو حلال مانیں اس کے حلال ہونے کا ثبوت قرآن سے دیں۔ اور جس کو حرام مانیں اس کے حرام ہونے کا ثبوت قرآن سے دیں۔ اور اگر قرآن سے نہ دے سکیں (اور یقینا نہیں دے سکیں گے) تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن میں ہر مسئلہ

بیان نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ ساتھ حدیث کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ان جانوروں کے حلال و حرام ہونے کا قاعدہ حدیث میں بیان کر دیا گیا ہے جس سے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سا جانور حلال ہے اور کون سا حرام۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ قرآن میں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ نماز کی حالت میں کھڑے ہونے، رکوع کرنے اور سجدہ کرنے کا ذکر بھی قرآن میں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ نماز میں پہلے کھڑے ہوں؟ یا پہلے رکوع کریں؟ یا پہلے سجدہ کریں؟ پھر کھڑے ہوں تو ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں یا لٹکا کر؟ ایک پاؤں پر کھڑے ہوں یا دونوں پر؟ لغت میں رکوع کا معنی ہے جھکنا، سوال یہ ہے کہ آگے جھکیں، یا دائیں جھکیں یا بائیں جھکیں؟ پھر جھکنے کی مقدار کیا ہو؟ ذرا سا سر نیچا کریں یا کمر کے برابر نیچا کریں یا اس سے بھی زیادہ نیچا کریں؟ پھر رکوع کی حالت میں ہاتھ کہاں ہوں؟ گھٹنوں پر ٹیکیں؟ یا دونوں رانوں کے بیچ میں رکھ کر بازوؤں کو ران پر ٹیکیں؟ یا ڈنڈے کی طرح لٹکنے دیں؟ اسی طرح سجدہ کیسے کریں؟ یعنی زمین پر سر کا کون سا حصہ ٹیکیں، پیشانی کا ٹھیک بچلا حصہ یا دایاں کنارہ یا بایاں کنارہ؟ سجدہ کی حالت میں ہاتھ کہاں رکھیں؟ رانوں میں گھسا لیں؟ یا زمین پر ٹیکیں؟ اور اگر زمین پر ٹیکیں تو صرف ہتھیلی زمین پر ٹیکیں یا پوری کہنی زمین پر ٹیکیں؟ سجدہ ایک کریں یا دو کریں؟

ان سوالات کا آپ جو بھی جواب دیں اس کا ثبوت قرآن سے دیں۔ ان مسائل کے بارے میں آپ کی عقلی تک بندیاں نہیں مانی جائیں گی۔ اور اگر قرآن سے ان سوالات کا جواب نہ دے سکیں (اور یقینا نہیں دے سکتے) تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حدیث کے بغیر قرآن کے حکم پر بھی عمل نہیں ہو سکتا۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ قرآن میں زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ نہ دینے والوں کو سخت عذاب کی دھمکی بھی دی گئی ہے۔ جس جس قسم کے لوگوں پر زکوٰۃ خرچ کرنی ہے انہیں بھی بتا دیا گیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ زکوٰۃ کب وصول کی جائے؟ یعنی زکوٰۃ روز روز دی جائے؟ یا سال بھر میں ایک مرتبہ دی جائے؟ یا پانچ سال یا دس سال یا بیس سال میں ایک مرتبہ دی جائے؟ یا عمر بھر میں ایک مرتبہ دی جائے؟ پھر یہ زکوٰۃ کس حساب سے دی جائے؟ اور کتنی کتنی دی جائے؟ یعنی غلہ کتنا ہو تو اس میں زکوٰۃ دی جائے؟ اور کتنے غلہ پر کتنی زکوٰۃ دی جائے؟ سونا یا چاندی کتنی ہو تو زکوٰۃ دی جائے؟ اور کس

حساب سے دی جائے؟

یہ سارے مسئلے قرآن سے ثابت کیجئے۔ اگر آپ قرآن میں یہ مسائل نہ دکھلا سکیں (اور ہرگز نہیں دکھلا سکتے) تو ثابت ہو گیا کہ حدیث کو مانے بغیر قرآن کے حکم پر بھی عمل ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ ان سارے مسائل کا بیان حدیث ہی میں آیا ہے۔

چوتھا سوال قرآن میں حکم ہے کہ مسلمان جنگ میں کفار کا جو مال غنیمت حاصل کریں اس کے پانچ حصے کر کے ایک حصہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر الگ نکال دیا جائے جو یتیموں، اور مسکینوں اور حاجت مندوں وغیرہ میں بانٹ دیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ باقی چار حصے کیا کئے جائیں؟ تمام مجاہدین پر برابر برابر بانٹ دئے جائیں یا فرق کیا جائے؟ کیونکہ بعض لوگ اپنا ہتھیار، گھوڑا، تیر، کمان، نیزہ، بھالا، زرہ، خَوَد، سواری کا جانور اور کھانے کا سامان خود لے کر جاتے تھے، اور بعض کو اسلامی حکومت کی طرف سے یہ سامان فراہم کئے جاتے تھے۔ اسی طرح بعض لوگ بڑی بہادری اور بے جگری سے لڑتے تھے، بعض دبکے رہتے تھے، کچھ اگلی صف میں رہتے تھے جن پر براہ راست دشمن کا وار ہوتا تھا۔ کچھ پیچھے رہتے تھے جو خطرہ سے دور رہتے تھے۔ اب اگر ان سب کو برابر دیں تو کیوں دیں؟ اور اس کا ثبوت قرآن میں کہاں ہے؟ اور اگر فرق کریں تو کس حساب سے فرق کریں؟ قرآن سے اس کا حساب بتائیے۔ اور اگر کمانڈر کی رائے پر چھوڑ دیں تو قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ کمانڈر کی رائے پر چھوڑ دیں؟

اس کی دلیل دیجئے۔ اگر قرآن میں ان مسئلوں کا کوئی حل نہیں ہے تو کیسے کہا جاتا ہے کہ قرآن میں سارے مسئلے بیان کر دئیے گئے ہیں۔

پانچواں سوال۔ قرآن میں حکم ہے کہ چوری کرنے والے مرد اور عورت کے ہاتھوں کو کاٹ دو۔ اب سوال یہ ہے کہ دونوں ہاتھ کاٹیں یا ایک ہاتھ؟ اور اگر ایک ہاتھ کاٹیں تو داہنا کاٹیں یا بایاں؟ پھر اسے کاٹیں تو کہاں سے کاٹیں؟ بغل سے؟ یا کہنی سے؟ یا کلائی سے؟ یا ان کے بیچ میں کسی جگہ سے؟

آپ جو جواب بھی دیں اس کا ثبوت قرآن سے دیں۔ اور اگر قرآن سے اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتے تو کیسے کہتے ہیں کہ قرآن میں ہر مسئلہ بیان کر دیا گیا ہے۔

چھٹا سوال ۔ قرآن میں یہ ارشاد ہے کہ جب جمعہ کی نماز کیلئے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو۔ اور خرید و فروخت چھوڑ دو، سوال یہ ہے کہ جمعہ کے دن کب پکارا جائے؟ کس نماز کے لئے پکارا جائے؟ کن الفاظ کے ساتھ پکارا جائے؟

جس نماز کے لئے پکارا جائے وہ نماز کیسے پڑھی جائے ان ساری باتوں کا ثبوت قرآن سے دیجئے۔ ورنہ تسلیم کیجئے کہ قرآن میں ہر مسئلہ بیان نہیں کیا گیا ہے۔

صاف بات یہ ہے کہ قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور جو باتیں ہم نے پوچھی ہیں ان باتوں میں اور اسی طرح زندگی کے بہت سارے مسئلے میں تنہا قرآن سے کسی طرح نہیں معلوم ہو سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کیا تھا۔ یہ طریقہ صرف حدیث سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اس لئے جب تک حدیث کو نہ مانیں خود قرآن پر بھی عمل نہیں کر سکتے۔ فی الحال یہی سوال پیش کر کے ہم آگے بڑھتے ہیں۔

انکار حدیث کے اصولی دلائل :

اس ایک اصولی دلیل کا حال جان لینے کے بعد آئیے اب مدھوپوری محقق صاحب کی زبانی چند اور اصولی دلیلیں سنئے! اس کے بعد ہمارا جواب ملاحظہ فرمائیے۔
موصوف نے خود ہی سوال قائم کیا ہے اور خود ہی جواب بھی دیا ہے۔ لکھتے ہیں:
سوال: دین میں مصطلحہ " حدیث" کا کیا مقام ہے؟
جواب: کچھ نہیں۔
(ا) دین حق ہے۔ اور اس کی بنا علم و یقین پر ہے۔ جس کی شہادت خود اللہ اور اس کے سچے فرشتے دیتے ہیں۔
﴿ لَٰكِنِ اللَّهُ يَشْهَدُ بِمَا أَنزَلَ إِلَيْكَ أَنزَلَهُ بِعِلْمِهِ وَالْمَلَائِكَةُ يَشْهَدُونَ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ﴾ سورة النساء (١٦٦)

(ب) دین عملاً ﴿مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ﴾ سورة الفتح (٢٩) کے ذریعہ بطریق احسن مکمل ہو چکا۔
﴿ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ﴾ سورة

المائدة (٣)

(ج) دین لوح قرآن پر لفظاً لفظاً اور حرفاً حرفاً بدرجہ اکمل محفوظ ہو گیا ہے۔
﴿ بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ ﴾ سورة البروج (٢١ -٢٢)

برعکس اس کے ہماری حدیثیں سب کی سب یکسر ظنی غیر یقینی اور روایت بالمعنی ہیں۔ دین سے اس کا کیا تعلق؟
﴿ إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ﴾ سورة يونس (٣٦) یعنی حق کے مقابلے میں "ظن" کا کوئی مقام نہیں ہے۔
﴿ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنفُسُ وَلَقَدْ جَاءَهُم مِّن رَّبِّهِمُ الْهُدَى ﴾ سورة النجم (٢٣)
"یعنی یہ لوگ محض "ظن" کے پیچھے دوڑتے ہیں دراصل وہ اپنی من مانی کرتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے ان کو ہدایت پہنچ چکی ہے"

۔ اور ایک مقام پر تو خاص کر مومنوں کو خطاب کر کے زیادہ ظن و گمان سے کوسوں دور رہنے کا حکم صادر کر دیا گیا ہے۔ بلکہ یہاں تک متنبہ کر دیا گیا ہے کہ بعض قیاس آرائیاں "صریح" گناہ کے درجہ تک پہنچ جاتی ہیں۔

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ﴾ سورة الحجرات(١٢)
وفات نبوی کے سینکڑوں سال بعد بعض ایرانیوں نے ادھر ادھر کی محض سنی سنائی اٹکل پچو باتوں (جنہیں اقوال رسول و اصحاب رسول سے منسوب کیا جاتا تھا) کا ذخیرہ جمع کر کے انہیں متفرق و متضاد روایتوں کو "صحیح حدیث" کا نام دے دیا۔ اور بعد والوں نے بعض دینی اور سیاسی مصالح کی بنا پر اس کو (بزعم خویش) جزو دین سمجھ لیا، اور اس طرح تفقہ فی الدین اور تدبر فی القرآن کا دروازہ اپنے اوپر بند کر لیا۔ اس سے قبل یہی روایتیں جب تک زید، عمرو بکر، کی زبانوں پر بے روک ٹوک گشت کرتی رہیں، ان کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی، لیکن قید کتابت میں آنے اور ان پر "صحیح" کا لیبل چپکانے کے بعد انہیں "فلاں نے فلاں سے کہا" اور "فلاں نے فلاں سے سنا" روایتوں کو بدقسمتی سے دین

کی اصل و اساس سمجھ لیا گیا! حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ مجموعہ ہائے روایات زیادہ سے زیادہ ایک طرح کے نیم تاریخی مواد کی حیثیت رکھتے ہیں اور بس۔ (نیم تاریخی ہم نے اس لئے کہا کہ اولا یہ فن تاریخ کے معیار پر پورے نہیں اترتے، اور دوسرے یہ کہ ان کتب احادیث کی اکثر روایات قصہ گویوں، واعظوں اور داستان سراؤں کی خود ساختہ روایات اور من گھڑت کہانیاں ہیں۔ نیز ان جھوٹی روایات اور فرضی واقعات کا عوام میں خوب خوب پرچار کرنے کے ذمہ دار بھی یہی وعاظ و قصاص کا گروہ رہا ہے۔)

ہماری " حدیث " کا ایک دوسرا تاریک پہلو بھی ہے جو پہلے سے زیادہ افسوس ناک ہے۔ اور جسے " اسلامی تاریخ " کا " المیہ " کہنا چاہیے ! مثلا حدیث کے مجموعوں میں ایسی روایتیں بھی بکثرت ملتی ہیں جو الزام تراشی دروغ بافی اور فحش نگاری کا مرقع ہیں! اس پر ستم ظریفی یہ کہ ان مخرب اخلاق اور حیا سوز " حدیثوں " کو منسوب کیا جاتا ہے قرآن کی برگزیدہ شخصیتوں کی طرف (جیسے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ، آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہ خصوصا حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہ اور اصحاب رسول علی الخصوص حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ) یا پھر سب و شتم کے تیر چلائے جاتے ہیں تو اگلی آسمانی کتابوں کی مثالی ہستیوں پر جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام، یوسف علیہ السلام ، داؤد علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام، اور مریم علیہ السلام وغیرہم۔ غرض صحف اولیٰ کی منتخب شخصیتیں ہوں یا صحیفہ آخر کی پسندیدہ ہستیاں کسی کی بھی عزت و آبرو راویان حدیث کی مشق ستم کا نشانہ بننے سے نہ بچ سکی۔

﴿ فَوَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ﴾ سورة الطور (۱۱)

واضح رہے کہ یہ روایتیں مسیلمہ کذاب یا ملا معین واعظ کاشفی جیسے مشہور دروغ گویوں کی نہیں ہیں۔ بلکہ عام مسلمانوں کے " مایہ ناز " اور " فخر روزگار " اماموں کے " ثقہ " راویوں کی ہیں جو آج تقریبا ہزار سال سے ان کتابوں کی زینت بنی ہوئی ہیں جو " اصح الکتب بعد کتاب اللہ " اور " مثلہ معہ " سمجھی جاتی رہی ہیں۔ وائے گر در پس امروز بود فردائے!

ان " تحقیقات عالیہ " اور " فرمودات طیبہ " کے بعد مدھوپوری " محقق " صاحب ایک "

نھوس حقیقت" کا عنوان لگا کر مزیدار ارشاد فرماتے ہیں۔

ہم مکلف ہیں ایمان لانے کے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ اور اللہ و رسول پر ایمان لانے کے معنی ہیں اللہ کو حق جاننا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم (رسول اللہ) پر نازل شدہ کتاب (قرآن) کو ماننا۔ بخلاف اس کے محض سنی سنائی باتیں جو صدہا سال تک ہر کہہ دمہ کی زبان پر بے روک ٹوک گشت کرتی رہی ہوں اور بالآخر انہیں محدثین نے بالکل غیر ذمہ دارانہ ذرائع سے معلوم کر کے اپنے بیاض میں نقل کی ہوں، ایسی غیر مستند اور غیر یقینی روایتوں کو اس صادق و مصدوق کی طرف منسوب کر کے انہیں سنت کا نام دینا اور ان پر ایمان لانے کے لئے مسلمانوں کو مجبور کرنا سراسر بے انصافی اور انتہائی زیادتی ہے!

مروجہ انجیل کا نسخہ جسے خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے قلمبند کیا تھا (جو سفر و حضر ہر حال میں آپ علیہ السلام کے رفیق و ہم جلیس رہ چکے تھے) اگر محض اس لئے قابل اعتناء نہیں سمجھا جا سکتا کہ یہ کام حضرت مسیح کی موجودگی میں نہیں بلکہ واقعہ رفع کے چالیس سال کے بعد انجام پایا تھا۔ تو یہ روایتیں جنہیں نہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قلمبند کروایا۔ نہ ہی آپ کے اصحاب میں سے کسی نے اس کی ضرورت سمجھی۔ بلکہ حضور کے سینکڑوں سال بعد بعض عجمیوں نے زید، عمرو بکر سے پوچھ پوچھ کر لکھ لیا ہو انہیں منزل من اللہ ماننے اور جزو دین قرار دینے کے لئے وجہ جواز کیا ہو سکتی ہے؟ اور یہ تدوین و ترتیب کے دوران تقویٰ و طہارت کا اہتمام یعنی ایک ایک روایت کو قلمبند کرنے سے پہلے تازہ غسل و وضو اور دو رکعت نفل ادا کرنے کا شاخسانہ نفسیاتی اعتبار سے ذہنوں میں روایتوں کی تقدیس و تکریم کا جذبہ خواہ کتنا ہی پیدا کرے لیکن نفس روایات کا جہاں تک تعلق ہے، یہ حقیقت ہے کہ اگر انہیں آب زمزم سے بھی غسل و وضو کر کے لکھا گیا ہوتا تو بھی اس عمل سے ان کی صحت و سقم میں کوئی فرق نہیں آتا۔

قرآن اللہ کا کلام ہے اس کا یقین کرنے کے لئے ہمیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانا ہو گا، بغیر آپ پر ایمان لائے قرآن کے کلام اللہ ہونے پر ہمارا ایمان لانا کسی درجہ میں معتبر نہ ہو گا۔ بعینہ اسی طرح روایتوں کو حدیث رسول ماننے کے لئے ایک ایک روایت کے راوی پر ایمان لانا ہمارے لئے ناگزیر ہو گا، بلکہ ہر روایت کے ہر

سلسلہ اسناد میں جتنے راوی ہوں گے ہر ایک پر بلا استثناءایمان لانا ہو گا! کیا ہمیں اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان ان گنت اصحاب اسماءالرجال پر ایمان لانے کی تکلفی دی گئی ہے؟إنا لله وإنا إليه راجعون۔

جواب

مدھوپوری "محقق" صاحب کا "سرمایہ تحقیقات" ختم ہوا۔اب آئیے اس پر ہمارا تبصرہ اور جائزہ ملاحظہ فرمائیے! ہم نے اس کے جواب میں انہیں لکھا تھا کہ آپ کا دعویٰ ہے کہ دین میں حدیث کا کوئی مقام نہیں۔اور اس دعویٰ کی آپ نے اپنے خیال میں دو دلیلیں رکھی ہیں۔دوسری دلیل پر تو ہم آگے گفتگو کریں گے۔

پہلی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ دین کی بناءعلم و یقین پر ہے۔اور احادیث ظنی ہیں۔اس ضمن میں آپ نے وہ آیات نقل کی ہیں جن میں ظن کی مذمت کی گئی ہے۔اور ظن سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔آپ کی یہ حرکت دیکھ کر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ حضرات نہ تو قرآن کو مانتے ہیں اور نہ اسے سمجھنے کا سلیقہ ہی رکھتے ہیں۔

شریعت میں ظن اور ظنیات کی حیثیت :

جناب عالی! قرآن مجید میں صرف ظن کی مذمت ہی نہیں کی گئی ہے۔بلکہ اس کی تعریف بھی کی گئی ہے۔اسے اختیار کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔اور اسے مدار نجات بھی قرار دیا گیا ہے۔سنئے فرمایا گیا ہے

﴿لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَذَا إِفْكٌ مُّبِينٌ﴾ سورۃ النـــور (۱۲)

جب تم لوگوں نے حضرت عائشہ پر الزام کے واقعہ کو سنا تو مومن مردوں اور مومنہ عورتوں نے اپنے نفسوں کے ساتھ اچھا ظن کیوں نہ قائم کیا؟ اور کیوں نہ کہا کہ کھلی ہوئی جھوٹی تہمت ہے۔

غور فرمائیے! اس میں صرف ظن کو اختیار ہی کرنے کا مطالبہ نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد پر ایک معاملہ کے بارے میں فیصلہ کن رائے قائم کرنے کا بھی مطالبہ ہے۔

ایک جگہ فرمایا گیا :

﴿وَاسْتَعِينُواْ بِالصَّبْرِ وَالصَّلاَةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلاَّ عَلَى الْخَاشِعِينَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلاَقُو رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ سورة البقرة٤٥-٤٦)

صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو اور بیشک یہ بھاری ہے مگر ان ڈرنے والوں پر جو یہ ظن رکھتے ہیں کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور یہ کہ وہ اسی کی طرف پلٹ کر جائیں گے۔ گویا قیامت کے وقوع اور اللہ سے ملاقات کا "ظن" رکھنا ایمان کی علامت ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے۔

﴿ أَلا يَظُنُّ أُولَئِكَ أَنَّهُم مَّبْعُوثُونَ﴾ سورة المطففين (٤)

کیا وہ لوگ ظن نہیں رکھتے کہ وہ ایک بڑے دن کے لئے اٹھائے جائیں گے؟ گویا بعث کا ظن نہ رکھنا عدم ایمان کی علامت ہے اور ڈنڈی مارنے جیسی برائیوں کا سبب ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے

﴿فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَيَقُولُ هَاؤُمُ اقْرَؤُوا كِتَابِيهْ إِنِّي ظَنَنتُ أَنِّي مُلَاقٍ حِسَابِيهْ ﴾ سورة الحاقة﴾ (١٩-٢٠) الخ

یعنی قیامت کے دن جس شخص کی کتاب اس کے دائیں ہاتھ میں دی جائے گی وہ کہے گا آؤ میری کتاب پڑھو۔ میں ظن رکھتا تھا کہ میں اپنے حساب سے ملوں گا۔ پھر وہ پسندیدہ زندگی یعنی بلند و بالا جنت میں ہو گا۔

لیجئے جناب! یہاں ایک ظنی عقیدے پر جنت مل رہی ہے اور آپ ظن اور ظنیات کو جہنم میں دھکیلنے پر تلے بیٹھے ہیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے ظن کی بنیاد پر توبہ و استغفار کیا تو ان کے اس عمل کو مدح و تعریف کے سیاق میں ذکر کیا گیا ہے ارشاد ہے :

﴿وَظَنَّ داودُ أنّما فتَنّهُ فاستغفرَ ربَّه وخرَّ راكعاً وأ نابَ﴾(سوره ص : ٢٤،٢٥)

داؤد نے یہ ظن کیا کہ ہم نے اسے آزمائش میں ڈال دیا ہے پس انھوں نے اپنے رب سے مغفرت مانگی اور رکوع کرتے ہوئے گر پڑے اور اللہ کی طرف جھک گئے۔ آپ ظنی چیز کا دین سے کوئی تعلق ہی نہیں سمجھتے اور قرآن ظن پر دین کے ایک حکم کا دارومدار رکھتا ہے

ارشاد ہے:

﴿ فَإِن طَلَّقَهَا فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَن يَتَرَاجَعَا إِن ظَنَّا أَن يُقِيمَا حُدُودَ اللّهِ﴾ سورة البقرة (٢٣٠)

یعنی مطلقہ ثلاثہ کا دوسرا شوہر اگر طلاق دے دے تو (پہلے شوہر اور اس کی مطلقہ) ان دونوں پر کوئی حرج نہیں کہ آپس میں تراجع کرلیں (یعنی پھر بذریعہ نکاح اکٹھا ہوجائیں) اگر یہ ظن کریں کہ وہ دونوں اللہ کی حدود قائم کرسکیں گے۔

غزوہ تبوک میں جو تین مومنین خالصین بلا عذر شریک نہ ہوئے تھے ان کی توبہ بھی جس مرحلے کے بعد قبول کی گئی اس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے:

﴿وَعَلَى الثَّلاَثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُواْ حَتَّى إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنفُسُهُمْ وَظَنُّواْ أَن لاَّ مَلْجَأَ مِنَ اللّهِ إِلاَّ إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُواْ إِنَّ اللّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ﴾ سورة التوبة (١١٨)

اور اللہ نے ان تین افراد کی توبہ بھی قبول کی جنہیں پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا یہاں تک کہ جب ان پر زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہوگئی اور ان کی جان پر بن آئی اور انہوں نے یہ ظن قائم کرلیا کہ اللہ کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں۔ پھر اللہ نے ان پر رجوع کیا تا کہ وہ توبہ کریں۔ بیشک اللہ توبہ قبول کرنے والا رحیم ہے۔

لیجئے جناب! کتنی صاف بات ہے کہ جب ان مخلفین نے حالات کی سختی کا مزا چکھ لیا اور یہ ظن قائم کرلیا کہ اللہ کے علاوہ کوئی جائے پناہ نہیں تو اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔ یعنی انہیں اللہ کی رحمت و مغفرت ان کے ظن کے نتیجہ میں حاصل ہوئی۔ یہ تو یہ، اسلام نے اسلامی عدالت کے تمام فیصلوں کی بنیاد صرف دو عادل گواہوں پر رکھی ہے، اس سے صرف زنا کا کیس مستثنیٰ ہے۔ لیکن ان دو عادل گواہوں کی عدالت و ثقاہت کس درجہ کی ہوگی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر وہ نماز کے بعد اللہ کی قسم اور اپنے اخلاص کا واسطہ دے کر گواہی دے رہے ہوں تب بھی قرآن نے ان کے بارے میں اس احتمال کو قبول کیا ہے کہ وہ جان بوجھ کر غلط بیانی سے کام لے سکتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو سورہ مائدہ آیات ١٠٦، ١٠٧، ١٠٨)

بلکہ گواہی کے سلسلے میں مزید ایک قانونی شق یہ رکھی ہے کہ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کافی ہوگی۔ (سورہ بقرہ : ٢٨٢) اور خود ہی یہ بھی بتلا دیا ہے کہ عورتوں کی تعداد ایک کے بجائے دو اس لئے رکھی جا رہی ہے کہ﴿ أن

ضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الأُخْرَى ﴾ سورۃ البقرۃ (٢٨٢) اگر ایک عورت معاملہ کو بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ یعنی ایسی گواہی بھی قبول کی جائے گی جو خود گواہی دینے والے کو یاد نہیں ہے۔ بلکہ گواہی دینے والا انسان دوسرے کی یاد دہانی کی بنیاد پر گواہی دے رہا ہے۔

کہئے جناب عالی! اس قسم کی گواہی " یقینیات" کے کس درجہ سے تعلق رکھتی ہے؟ اور یہ ڈھیل تو رہی نظام عدالت کے سلسلے میں، باقی رہیں خبریں تو ان کے سلسلے میں اس سے بھی زیادہ وسعت اور گنجائش رکھی گئی ہے۔ حکم دیا گیا ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ﴾سورۃ الحجرات (٦)
اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق آدمی کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کر لو الخ۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی صاحب تقویٰ اور صالح آدمی خبر لائے تو تحقیق بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔

کہئے جناب محترم! قرآن میں نہ صرف ظن کی تعریف کی گئی ہو بلکہ اس پر دین کے بعض احکامات کا دارومدار رکھا گیا ہو۔ اسی پر پورے نظام عدالت کی بنیاد رکھی گئی ہو، اسی ظن کی بنیاد پر فیصلہ کن رائے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہو، اسی ظن کے تحت توبہ و استغفار کرنے والوں کی بخشش کی گئی ہو۔ حتیٰ کہ اسے آخرت میں نجات کا سبب قرار دیا گیا ہو۔ تو آپ کو یہ بات کہاں تک زیب دیتی ہے کہ آپ احادیث پر " ظنی " ہونے کی پھبتی چست کریں، اور دوسروں کو تفقہ فی الدین اور تدبر فی القرآن سے محروم قرار دیتے پھریں، دراں حالیکہ اس محرومی کے شکار درحقیقت آپ خود ہیں۔ محترم کہنا پڑتا ہے کہ :ایاز قدر خود بشناش۔

کیا محدثین عجمی تھے؟

یہ حقیقت اچھی طرح یاد رہے کہ جن محدثین نے احادیث کو کتابی شکل میں جمع کیا ہے ان سب کو یا ان کی اکثریت کو عجمی قرار دینا محض فریب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج حدیث کی جو کتابیں امت میں رائج، مقبول اور متداول ہیں چند ایک کے سوا سب کے مصنفین عرب تھے۔ ہم ذیل میں اس طرح کے عرب محدثین کی فہرست دے رہے ہیں۔ تا کہ واقعی حقیت دوٹوک طور پر واشگاف ہو جائے۔

عرب محدثین قبیلہ

	عرب محدیثین		قبیلہ
1.	امام مالک	179ھ	ذی صبح
2.	امام شافعی	204ھ	قریش
3.	امام حمیدی	219ھ	قریش
4.	امام اسحاق بن راہویہ	238ھ	بنو تمیم
5.	امام احمد بن حنبل	241ھ	بنو شیبان
6.	امام دارمی	255ھ	بنو تمیم
7.	امام مسلم	162ھ	بنو قشیر
8.	امام ابوداؤد	275ھ	بنو ازلہ
9.	امام ترمذی	279ھ	بنو سلیم
10.	امام حارث بن ابی سامہ	282ھ	بنو تمیم
11.	امام ابوبکر بزار	292ھ	بنوازد
12.	امام نسائی	303ھ	
13.	امام ابویعلیٰ	307ھ	بنو تمیم
14.	امام ابوجعفر طحاوی	321ھ	بنوازد

15.	امام ابن حبان	354ھ	بنو تمیم
16.	امام طبرانی	360ھ	لخم
17.	امام دارقطنی	385ھ	
18.	امام حاکم	405ھ	بنوضبہ

عجمی محدثین:

عجمی محدیثین

1.	امام ابن ابی شیبہ	235ھ
2.	امام بخاری	256ھ
3.	امام ابن ماجہ	273ھ
4.	امام ابن خزیمہ	311ھ

اس فہرست سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جن محدثین کی کتابیں رائج اور مقبول ہیں ان میں عرب اور صرف عجمی ہیں۔ مولانا ضیاءالدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین اعظم گڑھ نے پہلی صدی ہجری میں پیدا ہونے والے محدثین سے لے کر آٹھویں صدی کے آخر تک وفات پانے والے مشہور اور صاحب تصنیف کا تفصیلی ذکر تذکرۃ المحدثین نامی کتاب کی دو جلدوں میں کیا ہے۔ ان محدثین کی کل تعداد ستر ہوتی ہے۔ جن میں سے صرف محدثین کے متعلق یہ صراحت ملتی ہے کہ وہ عجمی تھے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کو عجمی یا ایرانی سازش قرار دینے میں کتنا وزن ہے۔ اور یہ نعرہ کس قدر فریب ہے۔

اسی کے ساتھ اگر یہ بات بھی مدنظر رہے کہ کتب احادیث کے لکھنے والوں میں پیشتر اور سرفہرست عرب محدثین ہیں۔ عجمی محدثین ان کے بعد ہیں۔ پھر ان عجمی محدثین نے اپنی کتابوں میں حدیثیں جمع کی ہیں وہ وہی حدیثیں ہیں جنہیں ان کے پیشرو اور ہم عصر عربوں نے اپنی کتابوں میں جمع کی ہیں تو مذکورہ بالا حقیقت مزید اچھی طرح بے نقاب ہوجاتی ہے۔

اب آپ بتائیے کہ آخر عربوں کے خلاف یہ کیسی سازش تھی جس کے دور اول کے تمام بڑے بڑے لیڈر عربی تھے۔ اور عربوں کے بعد ترکستانی اور خراسانی تھے۔ جو نسلاً عربی نھے۔ اور اگر عربی نہ بھی تسلیم کریں تو پھر ایرانیوں سے **کیوں رقابت** رکھتے تھے۔ اور انہوں نے سازش کا سارا مواد اپنے پیشرو عرب لیڈروں سے حاصل کیا تھا۔ اگر بدقسمتی سے اس دور کے " سازشی ٹولے " میں ایک آدھ ایرانی نے شریک ہو کر ان کی کفش برادری اور خوشہ چینی کی بھی تو اس کو کوئی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ یا تو اس کی تصنیف کو درجہ استناد ہی نہیں دیا گیا۔ یا دیا بھی گیا تو سب سے نچلے درجہ کا؟

ہاں ذرا یہ بھی بتلا دیجئے کہ آخر یہ کیسی " ایرانی سازش " تھی کہ " سازشی ٹولے " اور ان کے سیاسی آقاؤں کے درمیان برابر ٹھنی رہتی تھی؟ کسی کو شہر بدر کیا جا رہا ہے۔ کسی پر شہر کے دروازے بند کئے جا رہے ہیں۔ کسی کو حوالہ زنداں کیا جا رہا ہے۔ کسی پر کوڑے برس رہے ہیں۔ کسی کی زخمی پیٹھ پر زہریلے پھائے لگائے جا رہے ہیں۔ کسی کے پاؤں میں بیڑیاں پہنائی جا رہی ہیں۔ کسی کے کندھے اوکھڑوا کر گدھے پر بٹھایا جا رہا ہے اور شہر میں گشت کرایا جا رہا ہے۔ اور کسی کے ساتھ کچھ اور ہو رہا ہے۔

پھر " سازشی ٹولہ " بھی کیسا ہے کہ آپنے آقاؤں سے ذرا دبتا نہیں؟ ان کے مقابل میں اکڑا ہوا ہے۔ ان کے بچوں کے لئے اسپیشل کلاس لگانے پر آمادہ نہیں۔ عام درس میں نمایاں اور مخصوص جگہ دینے کو تیار نہیں۔ ان کے ہدایا اور تحائف کو پوری بے نیازی کے ساتھ ٹھکرا دیتا ہے۔ اور ان کے دربار میں بھول کر بھی حاضر نہیں ہوتا۔ اگر کبھی حاضری کیلئے مجبور بھی کیا جاتا ہے تو وہ کھری کھری سناتا ہے کہ بلائیں ٹوٹ پڑتی ہیں۔ کیا یہی لچھن ہوتے ہیں سازشیوں کے؟

آخر یہ کیسا نادان " سازشی ٹولہ " تھا کہ جن سیاسی مصالح کے حصول کے لئے اس نے اتنی خطرناک سازش رچی تھی ان ہی سیاسی مصالح کے خلاف برسر پیکار رہا۔ اور اس راستے میں جو جو مصیبتیں جھیلنی پڑیں نہایت ہی استقلال کے ساتھ جھیلتا رہا۔

اس " ایرانی سازش " کا ایک اور پہلو بھی خاصا دلچسپ ہے۔ اس سازشی ٹولے کی جمع کی ہوئی کتب احادیث میں ایسی احادیث بھی ہیں جن میں قبیلوں، قوموں اور ملکوں کے فضائل و مناقب یا خرابیاں اور کمزوریاں بھی بیان کی گئی ہیں۔ اس قسم کی احادیث میں

حجاز کو دین کی پناہ گاہ کہا گیا ہے (بخاری و مسلم وغیرہ) یمن کو ایمان و حکمت کا مرکز قرار دیا گیا ہے۔ (ایضا) شام کو اسلام کی چوٹی کی شخصیتوں کا مرکز، اللہ کی منتخب کی ہوئی زمین اور اسلام کا مستحکم قلعہ کہا گیا ہے۔ اور اس کے لئے دعائیں کی گئی ہیں (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، مسند احمد) لیکن جانتے ہیں مشرق کو عموما اور ایرانیوں کے مرکز اقتدار (عراق) کو خصوصا احادیث میں کیا مقام عطا ہوا ہے؟ اسے فتنہ و فساد کا مرکز اور اجڈوں اور اکھڑوں کا مسکن قرار دیا گیا ہے۔ اس پر قدرتی آفات اور نباہیوں کی آمد کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ اور اسے ابلیس کی قضائے حاجت کا مقام بتلایا گیا ہے۔ (بخاری طبرانی وغیرہ) اگر ایک آدھ حدیث میں اہل ایران سے متعلق کوئی فضیلت آ بھی گئی ہے تو صرف چند افراد کے لئے رجال من ھولائی۔

بتائیے! آخر یہ کیسے " بدھو " قسم کے " سازشی " لوگ تھے کہ سارے فضائل و کمالات تو عطا کر دئیے اپنے عرب دشمنوں کو؟ اور ساری پستی اور خرابی منتخب کر لی اپنے لئے اور اپنے آقاؤں کے لئے؟ کیا سازش اسی طرح کی جاتی ہے؟ اور کیا ایسی ہی الٹی سیدھی تدبیروں سے سیاسی بالادستی حاصل ہوتی ہے؟
بریں عقل و دانش بباید گریست

آئیے آپ کو ایک اور حقیقت کی طرف متوجہ کروں۔ جسے مولانا محمد اسماعیل صاحب مرحوم آف گوجرانوالہ نے لکھا ہے۔ لکھتے ہیں:
پھر آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ سرزمین حجاز سے شروع ہو کر اسلامی حکومت اقطار عالم تک لاکھوں مربع میل زمین پر پھیلی ہوئی تھی۔ آپ یہ سوچیں آپ کو صلح سے کوئی ملک ملا۔ خود سرزمین حجاز میں قدم قدم پر لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ مکہ پر فوج کشی کی ضرورت ہوئی۔ نجد لڑائی سے ملا۔ شام، عراق، حبش، یمن کے بعض علاقوں پر لڑنا پڑا۔ سمندر کے ساحلی علاقوں پر جنگیں ہوئیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زندگی میں کم و بیش بیاسی جنگیں لڑنا پڑیں۔ پھر یہ جنگوں کا سلسلہ خلیفہ ثالث کی حکومت کے درمیانی ایام تک جاری رہا۔ پھر خلیفہ ثالث کے آخری دور سے شروع ہو کر حضرت علی کا پورا زمانہ قریب قریب باہمی آویزش کی نذر رہا۔ ۴۱ھ کے بعد جوں ہی ملک میں امن قائم ہوا خلفائے بنی امیہ نے شخصی کمزوریوں کے باوجود جہاد فی سبیل اللہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ہندوستان، اندلس، بربری،

الجزائر، تمام علاقے جنگ ہی سے اسلامی قلمرو میں شامل ہوئے۔ پھر آپ کے قلم اور دماغ نے سازش کا تزلہ صرف فارس پر کیوں گرایا؟ محض ملک گیری اور فتوحات کی بناءپر بغاوتیں، سازشیں تصنیف کی جا سکتی ہیں تو حجازی سازش، ہندوستانی سازش، بربری اوراندلسی سازش کیوں نہیں بنائی گئی، کیا شام کے یہودی معصوم، عراق اور روم کے مشرک اور عیسائی فارسیوں سے زیادہ پاک باز تھے؟ ان کی حکومتیں مسلمانوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ نہیں اتریں؟ مصر میں اسلامی فتوحات سے قبطی اور مصری قوموں کا وقار پامال نہیں ہوا۔ پھر آپ مصری سازش کے متعلق کیوں نہیں سوچتے؟

اگر عقل کا دیوالہ نہیں دے دیا گیا تو اپنی فتوحات کی پوری تاریخ پر غور فرمائیے۔ چین کے سوا شاید ہی کوئی ملک ہے جہاں مسلمانوں کے خون نے زمین کو لالہ زار نہ کیا ہو۔ مغربی سمندر کے سوا حل پر آپ کی فوجیں برسوں لنگر انداز رہیں۔ ان لوگوں پر آپ کو سازش کا شبہ کیوں نہیں۔آپ الٹا خود ہی ان کی سازش کا شکار ہو گئے۔

غزالی، ابن مکرم، ابن عربی، ابن العربی شاطبی۔ ابن حزم، یحییٰ بن یحییٰ مصمودی وغیرہم، فرطبہ اور اندلس کے علماءکو سازشی نہیں کہا جاتا۔ اگر خراسان، بخارا، قزوین، ترمذ، نساءکے علماءپر حدیث سازی کی تہمت اس لئے لگائی گئی ہے کہ ان بزرگوں نے سنت کے پرانے تذکروں، صحابہ اور تابعین کی بیاضوں اور سلف امت کے مسودات سے تدوین حدیث کے لئے راہیں ہموار کیں تو علمائے اندلس نے بھی سنت کی کچھ کم خدمت نہیں کی کہ شروح حدیث، فقہ الحدیث اور علوم سنت کی خدمت میں ان بزرگوں نے لاکھوں صفحات لکھ ڈالے۔ ان خدمات کو کیوں سازش نہیں کہا گیا۔ منکرین سنت کے پورے خاندان میں کوئی عقلمند نہیں جو ان حقائق پر سنجیدگی سے غور کرے، کیا علوم دینی اور فنون نبوت کی ساری داستان میں آپ کو صرف علمائے فارس ہی مجرم نظر آئے۔

من کان هذا القدر مبلغ علمه فليستتر بالصمت والكتمان

حدیث کی تشریعی اہمیت ص ۲۹۔ ۷۱)

آئیے اس " ایرانی سازش " کے متعلق مولانا موصوف کے بعض اور تبصرے ملاحظہ فرماتے چلئے۔ مولانا موصوف کہتے ہیں:

" آج سے تقریبا ایک صدی پہلے حکومت نہ انتخابی تھی نہ جمہوری نمائندگی کی سند

ان کو حاصل تھی۔ نہ وہ حکومتیں عوام کے سامنے جواب دہ ہوتی تھیں۔ بلکہ اس وقت کی حکومتیں شخصی ہوتی تھیں۔ یا زیادہ سے زیادہ کوئی قوم حاکم ہو جاتی، باقی لوگ محکوم ہوتے تھے۔ اقتدار میں عوام کی جوابدہی قطعاً ملحوظ نہیں رکھی جاتی تھی۔ نہ حکومت کسی آئین کی پابند ہوتی تھی۔ بادشاہ کی رائے اور بادشاہ کا قلم پورا آئین ہوتا تھا۔ یا وہ لوگ جو بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملا کر حکومت کے منظور نظر ہو جائیں۔

ایسی حکومتوں کے ساتھ ہمدردی ذاتی ضرورتوں کی وجہ سے ہوتی تھی۔ یا بادشاہ کے ذاتی اخلاق اور کیڑکٹر کی وجہ سے۔ اگر کوئی انقلاب ہو جائے تو انقلاب سے ملک متاثر تو ہوتا تھا۔ لیکن اس کی وجہ بادشاہ یا اس کے خاندان کے ساتھ ہمدردی نہیں ہوتی تھی، بلکہ یہ تاثر آنے جانے والی حکومتوں کے مقاصد کی وجہ سے ہوتا۔

فارسی حکومت شخصی تھی۔ یزد جرد کی موت پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ یزدجرد کا خاندان یقینا اس انقلاب میں پامال ہوا ہو گا۔ لیکن تاریخ اس وقت کسی ایسی سازش کا پتہ نہیں دیتی جو اس خاندان کے ساتھ ہمدردی کے طور پر کی گئی ہو۔

نوشیرواں کے بعد ویسے بھی کسریٰ کی حکومت روبانحطاط تھی، ان کے کردار میں عدل و انصاف کے بجائے استبداد روز بروز بڑھ رہا تھا۔ عوام کو حکومت کے ساتھ کوئی دلچسپی اور محبت نہیں تھی۔ پھر سازش کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

مذہباً فارسی حکومت آتش پرست تھی۔ اسلام نے توحید کے عقیدہ کی سادگی سے یہودیت اور عیسائیت تک کو متاثر کیا۔ بت پرستی ان کے سامنے نہ ٹھہر سکی۔ آتش پرستی کی وہاں کیا مجال تھی۔ اسلام کی تعلیمات اس مسئلہ میں نہایت مدلل اور واضح نہیں، ان میں کوئی چیز ڈھکی چھپی نہ تھی۔ اسلام کا موقف عقیدہ توحید کے معاملے میں کھلی کتاب تھی۔ وہ دوسروں کے شبہات اور اعتراضات بڑی کشادہ دلی سے سنتا تھا۔ مخالفین کے شبہات کی تردید اور اصلاح میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا تھا۔ نہ ہی اپنے نظریہ کو کسی پر جبراً ٹھونستا تھا۔ پھر اس کے خلاف کیوں سازش کی جائے؟ کون کرے؟ اور کس طرح کرے؟ فارسی حکومت کا چراغ خلیفہ ثانی کی حکومت میں گل ہوا۔ یزدجرد کو خود اس کی رعایا نے قتل کیا۔ اور اس کے خاتمہ میں مسلم عساکر کی مدد کی۔ پھر سازش کی ضرورت کیسے ہوئی؟

فارس کی فتح کے بعد ہزاروں فارسی اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے۔ جزیہ دیتے رہے، انہیں کسی نے بھی کچھ نہیں کہا۔ ان کے معبد (آتش کدے) مدتوں قائم رہے۔ جو لوگ ان سے اسلام کی طرف راغب ہوئے انہیں اسلام نے پوری ہمدردی کے ساتھ اپنی آغوش میں عزت کی جگہ دی۔

جہاں مذہب یوں آزاد ہو اور سیاست اس طرح بے اثر، ملک کے عوام مسلمانوں کی فتوحات پر خوشیاں مناتے ہوں، جب وہ جنگی مصالح کی بنا پر کسی مقام سے پیچھے ہٹنا پسند کریں تو اس علاقہ میں صف ماتم بچھ جائے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ادارہ طلوع اسلام اور جناب اسلم جیراجپوری نے سازش کے جراثیم کو کون سی عینک سے دیکھ لیا۔

تاریخ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی عدل گستری اور انصاف پسندی کی وجہ سے فارسی بالکل مطمئن ہو گئے تھے۔ اس لئے انہوں نے سیاست چھوڑ کر فاتحین کی علم دوستی کے اثرات سے فارس کے تمام ذہین لوگ فورا علم کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس راہ میں انہوں نے آخرت کی سربلندیوں کے علاوہ علمی دنیا میں بہت بڑا نام پیدا کیا، اور حکومت کے خلاف سازش کا ان کی زبان پر کبھی نام تک نہیں آیا۔

یہ سازش کا پورا کیس مولانا جیراجپوری کے کاشانہ اور ادارہ نے طلوع اسلام کے دفتر میں تیار ہوا ہے۔ واقعات کی روشنی میں اسے ثابت کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

سازش کی یہ عجیب قسم ہے کہ سازشیوں نے فاتحین کا مذہب قبول کیا۔ پھر ان کے علوم کی اس قدر خدمت کی کہ فاتحین اپنے علوم کی حفاظت سے بے فکر اور کلی طور پر مطمئن ہو گئے۔ پھر فاتحین نے ان میں سے اکثر علوم اور علماء کی سرپرستی کی۔ (مقدمہ ابن خلدون/٥)

معلوم ہے کہ اموی خلفاء کے وقت شاہی درباروں میں عجمیوں کو وہ اقتدار حاصل نہ تھا جو عباسی درباروں میں برامکہ کو حاصل ہوا۔ لیکن اس کا دامن دین کی خدمات سے بالکل خالی تھا۔ قرآن و سنت اور دینی علوم تو بڑی بات ہے برامکہ سے تو عربی زبان کی بھی کوئی خدمت نہ ہو سکی۔

ہارون الرشید نے امام مالک اور ان کے درس کی سرپرستی کی کوشش کی۔ لیکن امام مالک

نے اسے بے اعتنائی سے مسترد کر دیا، روپیہ دینے کی کوشش کی تو پورے استغناء سے واپس کر دیا۔

سازش کا آخر یہی مقصد ہو سکتا تھا کہ شاہی دربار تک رسائی ہو، مال و دولت اور حکومت میں حصہ ملے، اب دربار خود در دولت پر حاضر ہوتا ہے، اپنی ساری بلندیاں چھوڑ کر پورے انکسار، انتہائی احترام سے خزانوں کے دروازے کھلتے ہیں۔ تھیلیاں باادب پیش ہوتی ہیں، اور "سازشی" ہیں کہ نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔

بادشاہ عرض کرتے ہیں تشریف لے چلئے، آنکھیں فرش راہ ہوں گی، فارسی سازش کے سرغنہ یا فن حدیث کے سالار قافلہ فرماتے ہیں:

والمدینۃ خیر لھم لو کانوا یعلمون

مطلب یہ کہ اس بڑے دربار سے علیحدگی میرے لئے ناممکن ہے۔ پھر سازشیوں کا یہ پورا گروہ مختلف عجمی ممالک سے ہزاروں میل سفر طے کر کے مدینہ منورہ پہنچ کر امام کی خدمت میں تحصیل علم کے لئے پیش ہوتا ہے۔ اور کوئی سوچتا نہیں کہ شیخ عرب ہے، یہ عجمی النسل کہیں پوری سازش کا راز فاش نہ کر دے۔

عرب استاد کے عجمی شاگرد مدتوں استفادہ کرتے ہیں اور انہیں علوم کا درس ہوتا ہے۔ ساتھی ساتھی پر جرح کرتا ہے۔ ایک دوسرے کی کمزوریوں کے کھلے بندوں تذکرے ہوتے ہیں۔ عرب محدثین عجمی علماء پر تنقید کرتے ہیں، عجمی اہل عرب کے نقائص کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لیکن اس سازش کا سراغ جس کے اختراع کا سہرا "طلوع اسلام" کے دفتر پر ہے نہ کسی عرب کو لگانہ کسی عجمی کو، نہ استاد نے اسے محسوس کیا نہ شاگرد نے نہ ساتھی نے۔

پھر تعجب یہ ہے کہ فارس کی فتح پہلی صدی کے اوائل میں ہوئی اور اس سازش کا منصوبہ تیسری صدی میں بنایا گیا۔ تقریبا پورے دو سال فارسی بے وقوف آرام کی نیند سوتے رہے۔ یعنی جب شکست کا درد اور کوفت تازہ تھی اس وقت تو فارسیوں کو کوئی احساس نہ ہوا۔ لیکن تین سو سال کے بعد درد کی بے قراریاں انگڑائیاں لینے لگیں۔ اور فارسی سازشیوں نے بخاری، مسلم اور کتب صحاح کی صورت اختیار کر لی۔ فیاللعقول واربابھا۔

پھر اتنی بڑی سازش نے اسلامی اور تعلیمی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دنیا کے مسلم اور غیر مسلم مورخوں کی آنکھیں بے کار ہو گئیں۔ قلم ٹوٹ گئے۔ اور زبانیں گنگ، ان کی ضیخم کتابیں اس عظیم الشان سازش کے تذکرے سے یکسر خالی ہیں۔ یہ راز سب سے پہلے یورپ کے ملحد مکتشفین پر کھلا۔ اور اس کے بعد دفتر طلوع اسلام کے دریوزہ گروں نے کچھ ہڈیاں مستعار لے لیں۔

﴿ فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُونَ ﴾ سورة البقرة(۷۹) (حدیث کی تشریعی اہمیت ص ۴۲ تا ۴۹)

ہماری ان گزارشات سے واضح ہو گیا کہ ایرانی سازش کا جو شاخسانہ آپکے راہنماؤں نے چھوڑا ہے وہ کوئی " ٹھوس حقیقت " نہیں بلکہ ایک " بدبو دار افسانہ " ہے جس نے اسلام کے دانا دشمن یہودی مستشرق گولڈ سیہر اور اس کے رفقاء کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ اور حافظ اسلم، مسٹر پرویز اور پاکستان کے کچھ بے علم یا محدود العلم کلرکوں کی گود میں پل کر جوان ہوا ہے۔ اور اب آپ جیسے " محقق " حضرات اسے عام مسلمانوں کی حلق میں ٹھونسنے کیلئے اپنے " سرمایہ تحقیقات " کی حیثیت سے اس کی نمائش کرتے پھر رہے ہیں۔

خیر جناب! " سازشی ٹولے " نے پہلی صدی میں اپنی " سازش " کا آغاز کیا اور تیسری صدی کے اخیر تک مکمل کر لیا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اب ہزار برس بعد یعنی اب سے کوئی اسی برس پہلے آپ حضرات کے ہوش و حواس نے انگڑائی لی۔ اور یہودی و صلیبی مستشرقین کی خوردبین لگا کر آپ حضرات نے یہ انکشاف کیا کہ یہ امت تو اپنے آغاز سے اب تک " ایرانی سازش " کا شکار ہے۔ یہ انکشاف بڑی دیر سے ہو سکا۔ اب یہ آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکا ہے۔ اس کی حیثیت مشت بعد ازجنگ کی ہے۔ اس لئے اسے شیخ سعدی رحمہ اللہ کے مشورہ کے مطابق آپ اپنے ہی کلے پر مار لیجئے۔ اتنی دیر کے بعد ایسی فوجداری مقدمات کی تفتیش نہیں ہو سکتی۔ اور نہ کوئی دانشمند اس موضوع پر سوچنے کی کوشش کر سکتا ہے۔

حجیت حدیث هفت روزہ اہلحدیث کراچی شمارہ نمبر ۷

انکار حدیث حق یا باطل؟ (حصہ سوم) **مولانا صفی الرحمن مبارکپوری**

روایتوں کے متفرق اور متضاد ہونے کی حقیقت:

آپ نے روایتوں کو متفرق اور متضاد لکھا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی غیر مسلم آپ سے یہ سوال کر بیٹھے کہ آپکا قرآن ابتداءاً متفرق تھا یا مجتمع؟ اور اگر مجتمع تھا تو کس لوح پر؟ وہ لوح کہاں ہے؟ اسے کس نے دیکھا ہے؟ اور اس بات کی شہادت کیا ہے کہ انہوں نے دیکھا ہے؟ پھر وہ شاہدین قابل اعتبار تھے بھی یا نہیں؟ انہوں نے اپنی شہادت کن کن لوگوں کے سامنے ادا کی؟ پھر ان لوگوں کی حیثیت کیا تھی؟ وھلم جرا، اگر آپکے سامنے ایسے سوالات پیش کر دئیے جائیں تو آپ کیا جواب دیں گے؟ حدیث تو خیر" فلاں نے فلاں سے اور فلاں نے فلاں سے" کے واسطے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ بھی جاتی ہے۔ مگر آپ لوح قرآن کے لئے تو اتنا بھی ثبوت فراہم نہیں کر سکتے۔

باقی رہا تضاد کا معاملہ تو یہ محض ایک " ہوا " ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں۔ صحیح احادیث میں کوئی تضاد نہیں۔ ظاہر بینی کے لحاظ سے اگر آپ حضرات نے کچھ مثالیں فراہم کر لی ہیں تو ایسی مثالیں قرآن کے نہ ماننے والوں نے خود قرآن سے فراہم کی ہیں تو کیا آپ تسلیم کر لیں گے کہ (نعوذ باللہ) قرآن میں بھی تضاد ہے؟ پھر آپ حضرات اپنی " تدبر فی القرآن " کی مخصوص صلاحیت کو بروکار لاتے ہوئے قرآنی آیات کا جیسا کچھ مفہوم سمجھتے ہیں ان کے لحاظ سے تو قرآن مجید تضاد سے بھرا نظر آئے گا۔ مثال دیکھنی ہو تو پچھلے اوراق پلٹ لیجئے (اور اگلے صفحات میں بھی ملاحظہ فرمائیے گا) آپ کی پیش کردہ جن قرآنی آیات پر ہم نے بحث کی ہے وہ سب کی سب آپ کے بتلائے ہوئے مفہوم کے اعتبار سے خود قرآن ہی کی دوسری آیات سے ٹکرا رہی ہیں۔

روایات کی کتابت میں تاخیر:

آپ کو اس کا بھی ادعا ہے کہ روایتیں کتابت میں آنے سے پہلے زید، عمرو، بکر، کی زبانوں پر بے روک ٹوک گشت کر رہی تھیں، اور قید کتابت میں آنے کے بعد اس پر" صحیح" کا لیبل چسپاں کر دیا گیا۔ ان کی حیثیت نیم تاریخی مواد کی ہے۔ وغیرہ

مجھے آپ لوگوں کی جراءت پر حیرت ہے۔ سنئے! جن حوالوں کی بنیاد پر آپ قید کتابت کی

تاریخ متعین کرتے یا کر سکتے ہیں انہیں حوالوں کی رو سے یہ بات بالکل صاف اور قطعی طور پر عیاں ہے کہ احادیث کے قید کتابت میں آنے سے پہلے صرف دو طبقے پائے جاتے ہیں، ایک صحابہ کرام کا طبقہ اور دوسرا تابعین عظام کا۔ پہلا طبقہ وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے (والذین معہ) سے تعبیر کیا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جن کی عملی معیت کو شامل کر کے آپ دین کو مکمل مان رہے ہیں۔ اور دوسرا طبقہ ان کے تربیت یافتگان کا ہے جسے قرآن نے (والذین اتبعوھم باحسان) سے تعبیر کیا ہے۔ کیا قرآن کے یہ دونوں مقدس طبقے آپ کی نگاہ میں ایسے ہی ایرے غیرے نتھو خیرے قسم کے ہیں کہ آپ انہیں زید، عمرو بکر، جیسی اہانت آمیز تعبیر کا نشانہ بنائیں، اور اقوال و افعال رسول کے متعلق ان کی روایت اور بیان کو ایک کافر کی بے سند اور تاریخی روایت کے برابر بھی نہ سمجھیں؟ ع
نفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

ہاں! یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ جن کتابوں اور حوالوں کی بنیاد پر آپ حضرات نے یہ شگوفہ چھوڑا ہے کہ جن حدیثوں پر " صحیح" کا لیبل چسپاں کیا گیا ہے وہ حدیثیں قید کتابت میں آنے سے پہلے زید، عمرو، بکر کی زبانوں پر بے روک ٹوک گشت کرتی تھیں، اور قصہ گویوں، داستان سراؤں اور واعظوں کی گھڑی ہوئی ہیں ان کتابوں اور حوالوں سے آپ حضرات اپنا دعویٰ قطعاً ثابت نہیں کر سکتے۔(ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا) ان کتابوں اور حوالوں سے جو کچھ سمجھا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے درمیان عملاً بھی محفوظ تھا اور قولاً بھی۔ اور اس کے بعد والے طبقوں تک منتقل ہوا۔ پھر تدوین حدیث کے زمانے میں کچھ لوگوں نے اپنی مختلف النوع اغراض کے لئے حدیثیں گھڑیں۔ اور کوشش کی کہ اپنی گھڑی ہوئی احادیث کو اسوۂ حسنہ یعنی صحیح احادیث کے ساتھ گڈ مڈ کر کے اپنے دیرینہ مقاصد حاصل کر لیں۔ مگر وہ اس میں بری طرح ناکام ہوئے۔ شیعوں نے اہل بیت کے سیاسی تفوق کے لئے حدیثیں گھڑیں۔

اباحیت پسندوں نے اپنی راہ ہموار کرنے کیلئے اور عقلیت پسندوں نے اپنی عقلیت کو وجہ جواز فراہم کرنے کیلئے۔ گھڑنے والوں نے اپنی جعلی احادیث کی ترویج کا طریقہ یہ سوچا کہ کچھ مشہور اصحاب حدیث کی صحیح اور قوی سندوں سے ان جعلی احادیث کو روایت کریں تا کہ کسی کو ان کی صحت میں شک نہ ہو۔ لیکن جوں ہی یہ روایتیں اہل علم کے سامنے آئیں گھڑنیوالے پکڑے گئے۔ کیونکہ کسی بھی بڑے محدث کے ہزاروں شاگرد ہوا کرتے تھے۔ اب ممکن نہ تھا کہ کوئی شخص اس محدث سے ایسی حدیث روایت کرے جو ان ہزاروں

شاگردوں میں سے کسی کو بھی معلوم نہ ہو اور وہ اس پر بھی اس کا اعتبار کر لیں۔ ایسے راوی پر فورا جرح شروع ہوتی تھی۔ پچیسیوں تنقیحات ایسی تھیں کہ کسی جعلساز کے لئے نکل بھاگنے کی کوئی راہ باقی نہ بچتی۔ تھوڑی سی زدوخورد کے بعد اسے ہتھیار ڈالدینے پڑتے۔ اور اپنی جعلسازی کا اقرار کر لینا پڑتا۔ محدثین نے حدیث کی صحت پرکھنے کیلئے ایسے سخت اصول و ضوابط بنائے اور ایسا کڑا معیار مقرر کیا کہ دنیا آج تک اس کی نظیر نہ لا سکی۔ کوئی دس لاکھ افراد کی زندگیاں کھنگال کر رکھ دیں۔ پھر جملہ افراد کو اس کسوٹی پر پرکھ کر کھرا کھوٹا الگ کر دکھایا۔

تدوین حدیث کے تیسرے اور چوتھے دور میں ان جعلی احادیث کا ذخیرہ بھی تالیفی شکل میں باقاعدہ علیحدہ کر دیا گیا، تا کہ حق کے راہ روکنے کے لئے کسی بھی مرحلہ میں مشکل پیش نہ آسکے۔

یہ ہے واقعہ کی اصل صورت جو ان کتابوں اور حوالوں سے مستفاد ہوتی ہے جن کی بنیاد پر آپ نے " ایرانی سازش " کا بدبو دار افسانہ تیار کیا ہے۔ اگر آپ کا ایمان بالقرآن آپ کو صدق و دیانت کی اجازت دیتا ہے تو واقعہ کو اس کی حقیقی صورت میں پیش کیجئے۔ اور قبول کیجئے، ورنہ اپنے دعویٰ کی دلیل لائیے!

آپ کے استدلال کی نوعیت بالکل یہی ہے کہ کسی گھر میں چور گھس جائے تو آپ گھر والے ہی کو چور کہنے لگیں، اور جب آپ سے ثبوت مانگا جائے تو آپ فرمائیں کہ ثبوت یہ ہے کہ اس کے گھر میں چور گھسے تھے۔ یا کوئی پولیس پارٹی ڈاکوؤں کو گرفتار کر لائے تو آپ پولیس پارٹی ہی کو ڈاکو کہیں۔ اور ثبوت یہ پیش کریں کہ انہوں نے ڈاکوؤں کو گرفتار کیا ہے۔

جناب والا! محدثین نے جعل سازوں سے کوئی حدیث روایت نہیں کی ہے۔ اور نہ اپنے ذخیرے میں ان کی روایات کو در آنے دیا ہے۔ بلکہ ان کی جعل سازی پکڑ کر لوگوں کو بتلایا ہے کہ فلاں نے فلاں سے روایتیں گھڑی ہیں۔ اس فرض شناسی پر خود محدثین اور ان کی روایتیں آخر موردالزام کیسے ٹھہر گئیں۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

آپ نے ذرا آگے چل کر اسی سلسلے میں انا جیل اربعہ کی استنادی حیثیت کی کمزوری بھی بطور شہادت پیش کی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ذہن پر یہ ضابطہ کابوس بن

کر مسلط ہو چکا ہے کہ کوئی بھی واقعہ اسی وقت قابل قبول ہو سکتا ہے جب کہ وہ علی الفور قید کتابت میں آ چکا ہو، صرف چند برسوں کی تاخیر بھی اسے مشکوک بلکہ ناقابل قبول بنا دینے کیلئے کافی ہے۔ اگرچہ درمیان کے ناقلین اور رواۃ کتنے ہی زیادہ مستند اور قابل اعتماد کیوں نہ ہوں، بلکہ خود واقعہ کے عینی شاہد ہی نے اسے کیوں نہ قلمبند کیا ہو۔

میں آپ سے عرض کروں گا کہ اگر آپ کا یہ ضابطہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر قرآن مجید کی استنادی حیثیت سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ قرآن مجید میں گزشتہ اقوام (قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم مدین واصحاب الایکہ، قوم ابراہیم، قوم لوط، قوم فرعون، قوم سبا وغیرہ وغیرہ) کے واقعات ان کے وقوع کے ہزار ہا ہزار برس کے بعد قلمبند کئے گئے ہیں۔ پھر آپکے مذکورہ بالا اصول کی رو سے انہیں کیونکر مستند تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ ایک دشمن اسلام بالکل آپ ہی کے لب و لہجہ اور انداز گفتگو میں کہہ سکتا ہے کہ یہ سارے واقعات عرب قصہ گو اور داستان سرا، اپنی شبانہ محفلوں، قومی میلوں اور بازاری اجتماعات میں دارا و سکندر اور رستم و اسفندیار کے قصوں کی طرح گرمئ محفل کے لئے بیان کیا کرتے تھے، یہ محض عرب کی دیومالائی کہانیوں کا حصہ تھے، ان کی کوئی حیثیت و اہمیت نہ تھی۔

بلکہ یہ زید عمرو، بکر کی زبان پر بے روک ٹوک گشت کیا کرتے تھے، لیکن ہزاروں برس بعد جب قرآن نے انہیں قصوں کو قانون قدرت کے تاریخی تسلسل کی شہادت کی حیثیت سے پیش کیا تو کلام الٰہی بن گیا جس پر ایمان لانا واجب قرار پا گیا۔ اور جس کا انکار کرنا کفر ٹھہر گیا۔ بھلا ان قصوں کا کیونکر اعتبار کیا جائے جو ہزار ہا برس تک قصہ گویوں اور داستان سراؤں کا موضوع سخن بنے رہے، ہر کہہ ومہ کی زبان پر بے روک ٹوک گشت کرتے رہے۔ اور جنہیں ان کے وقوع کے ہزار ہا برس بعد ایک نبوت کے دعویدار نے قید کتابت میں لا کر وحی الٰہی اور دین و ایمان کا جزو قرار دے دیا۔

بتائیے! اگر آپ کے سامنے دشمن اسلام یہ سوال پیش کر دے تو آپ اپنے مذکورہ بالا اصول پر قائم رہتے ہوئے کیا جواب دے سکتے ہیں؟ اور اگر قرآن کی استنادی حیثیت ماننے اور منوانے کے سلسلے میں آپ اس اصول کے پابند نہیں تو حدیث کی استنادی حیثیت کے معاملے میں اس اصول کی پابندی پر آپ کو اصرار کیوں ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کو محفوظ، مستند اور قابل اعتماد قرار دینے کے لئے اس

کا قید کتابت میں لایا ہوا ہونا ضروری نہیں ہے۔ یعنی یہ اصول اور معیار ہی سرے سے غلط ہے کہ اگر کوئی بات اپنے وقوع کے وقت قید کتابت میں آگئی تو قابل اعتماد ہو گی ورنہ نہیں۔ اس لئے یہ خیال صحیح نہیں کہ قرآن اس لئے قابل اعتماد و استناد ہے کہ وہ لکھوا لیا گیا تھا۔ اور احادیث اس لئے قابل اعتماد و استناد نہیں کہ وہ عہد رسالت اور عہد خلافت میں لکھوائی نہیں گئی تھیں۔

بلکہ اس سلسلہ میں معاملہ کی جو صحیح نوعیت ہے اسے ذیل کے الفاظ میں سنئے:
اس سلسلے میں پہلی بات یہ سمجھ لینی چاہئے کہ قرآن کو جس وجہ سے لکھوایا گیا وہ یہ تھی کہ اس کے الفاظ اور معنی دونوں من جانب اللہ تھے، اس کے الفاظ کی ترتیب، اور اس کی آیتوں اور سورتوں کی ترتیب بھی اللہ کی طرف سے تھی۔ اس کے الفاظ کو دوسرے الفاظ سے بدلنا بھی جائز نہ تھا۔ اور وہ اس لئے نازل ہوا تھا کہ لوگ انہی الفاظ میں اسی ترتیب کے ساتھ اس کی تلاوت کریں۔ اس کے مقابل سنت کی نوعیت بالکل مختلف تھی، وہ محض لفظی نہ تھی، بلکہ عملی بھی تھی۔ اور جو لفظی تھی اس کے الفاظ قرآن کے الفاظ کی طرح بذریعہ وحی نازل نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ حضور نے اس کو اپنی زبان میں ادا کیا تھا۔ پھر اس کا ایک بڑا حصہ ایسا تھا جسے حضور کے ہم عصروں نے اپنے الفاظ میں بیان کیا تھا۔ مثلا یہ کہ حضور کے اخلاق ایسے تھے، حضور کی زندگی ایسی تھی۔ اور فلاں موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں عمل کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور تقریریں نقل کرنے کے بارے میں بھی یہ پابندی نہ تھی کہ سننے والے انہیں لفظ بلفظ نقل کریں۔ بلکہ اہل زبان سامعین کے لئے یہ جائز تھا اور وہ اس پر قادر بھی تھے کہ آپ سے ایک بات سن کر معنی و مفہوم بدلے بغیر اسے اپنے الفاظ میں بیان کر دیں۔ حضور کے الفاظ کی تلاوت مقصود نہ تھی۔ بلکہ اس تعلیم کی پیروی مقصود تھی جو آپ نے دی۔ احادیث میں قرآن کی آیتوں اور سورتوں کی طرح یہ ترتیب محفوظ کرنا بھی ضروری نہ تھا کہ فلاں حدیث پہلے ہو اور فلاں اس کے بعد۔ اس بناء پر احادیث کے معاملے میں یہ بالکل کافی تھا کہ لوگ اسے یاد رکھیں، اور دیانت کے ساتھ انہیں لوگوں تک پہنچائیں۔ ان کے معاملے میں کتابت کی وہ اہمیت نہ تھی جو قرآن کے معاملے میں تھی۔

دوسری بات جسے خوب سمجھ لینا چاہئے، یہ ہے کہ کسی چیز کے سند اور حجت ہونے کے لئے اس کا لکھا ہوا ہونا قطعا ضروری نہیں ہے۔ اعتماد کی اصل بنیاد اس شخص یا ان اشخاص کا بھروسے کے قابل ہونا ہے جس کے یا جن کے ذریعہ سے کوئی بات دوسرے تک

پہنچے، خواہ وہ مکتوب ہو یا غیر مکتوب۔ خود قرآن کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے لکھوا کر نہیں بھیجا۔ بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اس کو بندوں تک پہنچایا۔ اللہ نے پورا انحصار اس بات پر کیا کہ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا مانیں گے وہ نبی کے اعتماد پر قرآن کو ہمارا کلام مان لیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قرآن کی جتنی تبلیغ و اشاعت کی زبانی ہی کی۔ آپ کے جو صحابہ مختلف علاقوں میں جا کر تبلیغ کرتے تھے وہ قرآن کی سورتیں لکھی ہوئی نہ لیجاتے تھے۔ لکھی ہوئی آیات اور سورتیں تو اس تھیلے میں پڑی رہتی تھیں جس کے اندر آپ انہیں کاتبان وحی سے لکھوا کر ڈال دیا کرتے تھے۔ باقی ساری تبلیغ و اشاعت زبان سے ہوتی تھی۔ اور ایمان لانے والے اس ایک صحابی کے اعتماد پر یہ بات تسلیم کرتے تھے کہ جو کچھ وہ سنا رہا ہے وہ اللہ کا کلام ہے۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حکم وہ پہنچا رہا ہے وہ حضور ہی کا حکم ہے۔

نیسرا اہم نکتہ اس سلسلے میں یہ ہے کہ لکھی ہوئی چیز بجائے خود کبھی قابل اعتماد نہیں ہوتی جب تک کہ زندہ اور قابل اعتماد انسانوں کی شہادت اس کی توثیق نہ کرے۔ محض لکھی ہوئی کوئی چیز اگر ہمیں ملے اور ہم اصل لکھنے والے کا خط نہ پہچانتے ہوں، یا لکھنے والا خود نہ بتائے کہ یہ اسی کی تحریر ہے، یا ایسے شاہد موجود نہ ہوں جو اس امر کی تصدیق کریں کہ یہ تحریر اسی کی ہے جس کی طرف منسوب کی گئی ہے تو ہمارے لئے محض وہ تحریر یقینی کیا معنی ظنی حجت بھی نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک اصولی حقیقت ہے جسے موجودہ زمانے کا قانون شہادت بھی تسلیم کرتا ہے۔ اور فاضل جج خود اپنی عدالت میں اس پر عمل فرماتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کے محفوظ ہونے پر ہم جو یقین رکھتے ہیں کیا اس کی بنیاد یہی ہے کہ وہ لکھا گیا تھا۔ کاتبین وحی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے صحیفے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے املا کرائے تھے آج دنیا میں کہیں موجود نہیں۔ اگر موجود ہوتے تو بھی آج کون یہ تصدیق کرتا کہ یہ وہی صحیفے ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوائے تھے۔ خود یہ بات بھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس قرآن کو نزول وحی کے ساتھ ہی لکھوا لیا کرتے تھے، زبانی روایات ہی سے معلوم ہوئی ہے، ورنہ اس کے جاننے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا۔ پس قرآن کے محفوظ ہونے پر ہمارے یقین کی اصل وجہ اس کا لکھا ہوا ہونا نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ زندہ انسان زندہ انسانوں سے مسلسل اس کو سنتے اور آگے زندہ انسانوں تک اسے پہنچاتے چلے آ رہے ہیں۔ لہٰذا یہ خیال ذہن سے نکال دینا چاہئے کہ کسی چیز کے محفوظ ہونے کی واحد سبیل اس کا لکھا ہوا ہونا ہے۔

ان امور پر اگر فاضل جج اور ان کی طرح سوچنے والے حضرات غور فرمائیں۔ تو انہیں یہ تسلیم کرنے میں ان شاءاللہ کوئی زحمت پیش نہ آئے گی کہ اگر معتبر ذرائع سے کوئی چیز پہنچے تو وہ سند بننے کی پوری قابلیت رکھتی ہے خواہ وہ لکھی نہ گئی ہو۔

نمام منکرین حدیث بار بار قرآن کے لکھے جانے اور حدیث کے نہ لکھے جانے پر اپنے دلائل کا دارومدار رکھتے تھے۔ لیکن یہ بات کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانے میں کاتبان وحی سے نازل شدہ وحی لکھوا لیتے تھے۔ اور اس تحریر سے نقل کر کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قرآن کو مصحف کی شکل میں لکھا گیا، اور بعد میں اسی کی نقلیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شائع کیں یہ سب کچھ محض حدیث کی روایات ہی سے دنیا کو معلوم ہوا ہے۔ قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ نہ حدیث کی روایات کے سوا اس کی کوئی دوسری شہادت دنیا میں کہیں موجود ہے۔ اب اگر حدیث کی روایات سرے سے قابل اعتماد ہی نہیں تو پھر کس دلیل سے دنیا کو آپ یقین دلائیں گے کہ فی الواقع قرآن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لکھا گیا تھا؟

کسی کا یہ کہنا کہ عہد نبوی کے رواجات، روایات، نظائر، فیصلوں، احکام اور ہدایات کا پورا ریکارڈ ہم کو " ایک کتاب " کی شکل میں مرتب شدہ ملنا چاہئے تھا درحقیقت یہ ایک خالص غیر عملی طرز فکر ہے۔ اور وہی شخص یہ بات کہہ سکتا ہے جو خیال دنیا میں رہتا ہو۔ آپ قدیم زمانے کے عرب کی حالت چھوڑ کر تھوڑی دیر کیلئے آج اس زمانے کی حالت کو لے لیجئے جب کہ احوال و وقائع کو ریکارڈ کرنے کیلئے ذرائع بے حد ترقی کر چکے۔ فرض کر لیجئے کہ اس زمانے میں کوئی لیڈر ایسا موجود ہے جو سال تک شب و روز کی مصروف زندگی میں ایک عظیم الشان تحریک کا انعقاد کرتا ہے۔ ہزاروں افراد کو اپنی تعلیم و تربیت سے تیار کرتا ہے۔ ان سے کام لے کر ایک پورے ملک کی فطری، اخلاقی، تمدنی اور معاشی زندگی میں انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اپنی قیادت و رہنمائی میں ایک نیا معاشرہ اور ایک نئی ریاست وجود میں لاتا ہے۔ اس معاشرے میں اس کی ذات ہر وقت ایک مستقل نمونۂ ہدایت بنی رہتی ہے۔

ہر حالت میں لوگ اس کو دیکھ دیکھ کر یہ سبق لیتے ہیں کہ کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ ہر طرح کے لوگ شب و روز اس سے ملتے رہتے ہیں۔ اور وہ ان کو عقائد و افکار، سیرت و اخلاق، عبادات و معاملات، غرض ہر شعبہ زندگی کے متعلق اصولی ہدایات بھی دیتا ہے اور

جزئی احکام بھی۔ پھر اپنی قائم کردہ ریاست کا فرمانروا، قاضی، شارع، مدبر اور سپہ سالار بھی ننہا وہی ہے۔ اور دس سال تک اس مملکت کے تمام شعبوں کو وہ خود اپنے اصولوں پر قائم کرتا اور اپنی رہنمائی میں چلاتا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آج اس زمانے میں یہ سارا کام کسی ایک ملک میں ہوتو اس کا ریکارڈ" ایک کتاب" کی شکل میں مرتب ہو سکتا ہے؟ کیا ہر وقت اس لیڈر کے ساتھ ٹیپ ریکارڈ لگا رہ سکتا ہے؟ کیا ہر آن فلم کی مشین اس کی شبانہ روز نقل و حرکت ثبت کرنے میں لگی رہ سکتی ہے؟ اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کیا آپ کہیں گے کہ وہ ٹھپا جو اس لیڈر نے ہزاروں لاکھوں افراد کی زندگی پر، پورے معاشرے کی ہیئت اور پوری ریاست کے نظام پر چھوڑا ہے سرے سے کوئی شہادت ہی نہیں ہے جس کا اعتبار کیا جا سکے؟

کیا آپ یہ دعویٰ کریں گے کہ اس لیڈر کی تقریر سننے والے، اس کی زندگی دیکھنے والے، اس سے ربط و تعلق رکھنے والے بے شمار افراد کی رپورٹیں سب کی سب ناقابل اعتماد ہیں، کیونکہ خود اس لیڈر کے سامنے وہ" ایک کتاب" کی شکل میں مرتب نہیں کی گئیں۔ اور لیڈر نے ان پر اپنے ہاتھ سے مہر تصدیق ثبت نہیں کی؟ کیا آپ فرمائیں گے کہ اس کے عدالتی فیصلے اور اس کے انتظامی احکام، اس کے قانونی فرامین، اس کے صلح و جنگ کے معاملات کے متعلق جتنا مواد بھی بہت سی مختلف صورتوں میں موجود ہے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ایک" جامع و مانع کتاب" کی شکل میں تو ہے ہی نہیں؟ (ترجمان القرآن منصب رسالت نمبر ص ۳۳۸، ۳۳۶، ۱۶۳، ۳۴، ۳۳)

اس وضاحت کے بعد یہ بھی عرض ہے کہ آپ ذخیرہ حدیث کو فن تاریخ کے معیار پر پورا اترتا ہوا تسلیم نہیں کرتے، اس لئے آپکو چیلنج ہے کہ آپ دنیا کے کسی اعلیٰ سے اعلیٰ معیار تاریخ کو معیار حدیث کے ہم پلہ ہی ثابت کر دیجئے، صرف بڑا بول بول دینا کوئی کمال نہیں۔

الزام تراشی اور فحش نگاری کے الزام کی حقیقت:

آپ نے منکرین حدیث کا وہ کا انداز ادعاء بلکہ انداز افتراء اختیار کرتے ہوئے حدیث کے ایک اور" تاریک پہلو" کی نشاندہی کی ہے۔ جسے آپ کے بقول" اسلامی تاریخ" کا" المیہ" کہنا چاہئے کہ حدیث کے مجموعوں میں ایسی روایات بکثرت ملتی ہیں جو" الزام تراشی" " دروغ بافی" اور" فحش نگاری" کا مرقع ہیں۔

اور اس" بکثرت" کی مقدار خود آپ لوگوں کی نشاندہی کے مطابق ایک فیصد بھی نہیں۔ کیا اسی کو" بکثرت" کہا جاتا ہے؟ پھر جہاں تک" دروغ بافی" کا سوال ہے تو حقیقت کھل چکی ہے۔ جب تک آپ یہودی مستشرقین کی خردبین لگا کر دیکھیں گے یرقان کے مریض کی طرح آپ کو ہر طرف دروغ ہی دروغ نظر آئے گا۔ کیونکہ یہ مرض آپ کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ اس کا واحد علاج یہ ہے کہ آپ حقیقت پسندی اختیار کریں۔ اور معاملہ کو اس کی صحیح اور اصل شکل میں ملاحظہ فرمائیں۔ ورنہ جب تک آپ گھر کے مالک اور محافظ کو چور اور پولیس پارٹی کو ڈاکو سمجھیں گے آپ کو اس بیماری سے نجات نہیں مل سکتی۔

باقی رہا" الزام تراشی" اور" فحش نگاری" کا دعویٰ تو یہ بھی سراسر زبردستی ہی ہے۔ آپ کے اشارے یا تو ان روایات کی طرف ہیں جن کے جھوٹ ہونے کی قلعی خود محدثین نے کھول دی ہے۔ لیکن آپ کمال ڈھٹائی سے ان چوری پکڑنے والوں ہی کو چور کہہ رہے ہیں۔ یا پھر آپ نے ایسی باتوں کو" الزام تراشی" اور" فحش نگاری" قرار دے دیا ہے جن کی نظیریں خود قرآن میں موجود ہیں۔ تو کیا (نعوذ باللہ) آپ قرآن میں" الزام تراشی" اور" فحش نگاری" تسلیم کریں گے؟ اگر نہیں تو پھر حدیث اور روایات کی ویسی ہی باتوں کو آپ" الزام تراشی" اور" فحش نگاری" قرار دینے پر کیوں تلے بیٹھے ہیں؟ آپ نے جن روایات کی طرف اشارہ کیا ہے آئیے انہیں میں سے ایک آدھ سے اس کی توضیح کر دوں۔

آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام لیا ہے۔ ان کی بابت صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں تین کذبات کا ارتکاب کیا ہے۔ کذب، جھوٹ، غلط اور خلاف واقعہ بات کو کہتے ہیں۔ صحیح بخاری کی یہ روایت سنتے ہی آپ حضرات بھی، اور قائلین حدیث میں سے بعض عقلیت پسند بھی سیخ پا ہو جاتے ہیں۔ لیکن آئیے ذرا سنجیدگی سے

اس روایت پر غور کریں۔

اس روایت میں جن تین کذبات کا انتساب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کیا گیا ہے ان میں سے دو کی تفصیلات خود قرآن میں مذکور ہیں۔ قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم سے باتیں کر رہے تھے، اچانک انہوں نے تاروں پر ایک نظر ڈالی اور کہا کہ میں بیمار ہوں۔ قوم چلی گئی اور حضرت ابراہیم نے جھٹ اٹھ کر ان کے بتوں کو توڑ پھوڑ ڈالا۔ قوم نے واپس آ کر معاملے کی تفتیش کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ تمہاری حرکت ہے؟ انہوں نے کہا، بلکہ اس بڑے بت نے یہ حرکت کی ہے اگر تمہارے یہ معبود بولتے ہیں تو ان سے پوچھ لو، الخ۔

اس میں دو باتیں قابل غور ہیں۔

1. ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیماری کا عذر جس سیاق و سباق میں کیا تھا اس کا منشا یا تو یہ تھا کہ میں تمہارے ساتھ چلنے کے لائق نہیں۔ یا یہ کہ بیماری کے سبب میرے لئے بات چیت کرنی مشکل ہے۔ لیکن جوں ہی قوم ہٹی، وہ جھٹ اٹھے۔ اور بتوں پر پل پڑے۔ اگر واقعۃً وہ ایسے ہی بیمار تھے جیسی بیماری کا اظہار فرمایا تھا تو کیا وہ بت خانے تک پہنچ سکتے تھے؟ اور بتوں کو توڑ سکتے تھے؟

2. دوسری بات یہ ہے کہ انہوں بت شکنی کا الزام بڑے بت پر عائد کیا۔ کیا واقعۃً اسی نے باقی بتوں کو توڑا تھا؟ یقینا نہیں، ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دونوں باتیں خلاف واقعہ کہی تھیں، جسے عربی زبان میں کذب کہتے ہیں۔

تیسرے واقعے کی تفصیل صحیح بخاری میں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی سیدہ سارہ کے ہمراہ ایک جابر حکمران کے علاقے سے گزرے، وہ حکمران خوبصورت عورتیں چھین لیتا تھا۔ اگر ساتھ شوہر ہوتا تو اس کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ حضرت سارہ کو بھی اس حکمران نے طلب کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ تم مجھے اپنا بھائی ظاہر کرنا۔ متعدد مآخذ میں اس کی وضاحت بھی ہے کہ حضرت سارہ کچھ دور کے تعلق سے حضرت ابراہیمؑ کی بہن ہوتی تھیں۔ یوں بھی وہ دینی بہن تھیں۔ لیکن جس سیاق میں وہ اپنے آپ کو بہن کہتیں اس سے سننے والا یہ سمجھتا کہ حقیقی بہن ہیں۔ اس لئے یہ بات

خلاف واقعہ ہوئی۔

یہ تینوں معاملے ایک اور پہلو سے بھی قابل غور ہیں۔ پہلے اور دوسرے موقع پر خلاف واقعہ بولے بغیر بھی مقصد حاصل ہو سکتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کہہ سکتے تھے کہ آج مجھے معاف رکھیں، میں آپ حضرات کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اسی طرح وہ بڑے بت کا نام لئے بغیر کہہ سکتے تھے کہ مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ اپنے ان معبودوں سے پوچھ لو اگر بولتے ہیں۔ لیکن تیسرا موقع بڑا نازک تھا۔ بیوی اور جان دونوں خطرے میں تھے۔ ایسی صورت میں قرآن نے ارتکاب کفر کی اجازت دی ہے:

﴿ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ ﴾ سورۃ النحل (۱۰۶)

اس لئے یہ تیسرا واقعہ بھی قرآن کی نگاہ میں معیوب نہیں۔

یہ ہے ان تین کذبات کا خلاصہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب ہیں۔ ان میں سے پہلے دو کی نسبت خود قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کی ہے۔ صحیح بخاری میں ان کا صرف حوالہ دیا گیا ہے۔ البتہ تیسرا واقعہ صرف صحیح بخاری میں ہے۔ اب ظاہر ہے کہ آپ اس نسبت کو " الزام تراشی " اور " دروغ بافی " کا مرقع قرار دے رہے ہیں تو آپ کے اس الزام کا صرف / حصہ صحیح بخاری پر عائد ہوتا ہے جس کے جواز کا فتویٰ دینے میں خود قرآن بھی شریک ہے اور اس الزام کا باقی / حصہ قرآن پر عائد ہوتا ہے۔ غور فرمائیے کہ آپ نے کس جسارت اور دلیری کے ساتھ حدیث دشمنی کے جوش میں قرآن مجید ہی کو " الزام تراشی " اور " دروغ بافی " کا مرقع قرار دے دیا۔ فنعوذ باللہ من شرور انفسنا۔ آپ نے حضرت یوسف علیہ السلام کا نام بھی لیا ہے۔ حالانکہ صحیح احادیث میں تو ان پر کوئی الزام نہیں۔ بلکہ انہیں کریم ابن کریم ابن کریم ابن کریم کہا گیا ہے۔ اور قیدخانے میں ان کی ثابت قدمی پر ان کی مدح و توصیف کی گئی ہے۔ البتہ قرآن میں یہ بتلایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنے حقیقی بھائی سے ساز باز کر کے ان کے غلے میں شاہی برتن رکھ دیا۔ پھر اپنے بھائیوں کے قافلے پر چوری کا الزام عائد کرا کر ان کی تلاشی لی۔ اور حقیقت چھپانے کیلئے پہلے دوسرے بھائیوں کی تلاشی لی۔ پھر اپنے حقیقی بھائی کے برتن سے غلہ نکال کر دوسرے بھائیوں سے لئے گئے اقرار کے مطابق اپنے حقیقی بھائی کو اپنے پاس روک لیا۔

غالباً آپ کے ذہن میں یہی واقعہ تھا۔ لیکن آپ کو یہ یاد نہیں رہا کہ اس کا ذکر قرآن میں ہے۔ اس لئے آپ نے اسے شان انبیاء کے خلاف سمجھ کر احادیث اور روایتوں پر " الزام تراشی " کا

الزام تراشنے میں اپنی چابکدستی کا مظاہرہ فرما دیا۔ لیکن آپکی اس چابکدستی کی زد حدیث کے بجائے قرآن پر آ پڑی۔

قریب قریب یہی معاملہ ان بقیہ شخصیتوں کا ہے جن کے اسماء گرامی آپ نے ذکر کئے ہیں، اگر تفصیل میں آپ جانا چاہتے ہیں تو چلئے ہم بھی تیار ہیں۔

سمجھ کے رکھیو قدم دشت خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

ہماری اس توضیح سے یہ حقیقت بھی سمجھ میں آگئی ہو گی کہ آیا امام بخاری کا نام سن کر جماعت اہلحدیث پر " سہم کا دورہ " پڑ جاتا ہے، یا آپ حضرات پر جوش مخالفت میں سرسامی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، جس کے بعد آپ حضرات کو ہوش ہی نہیں رہتا کہ آپ کیا بک رہے ہیں۔ اور کس کے خلاف بک رہے ہیں۔

آپ نے حدیث پر " مثلہ معہ " کی پھبتی بھی چست فرمائی ہے۔ مگر بتائیے کہ جب قرآن مجید نے اسوۂ رسول کو مدار نجات قرار دے کر اپنے بنیادی احکام تک کی تفصیلات اسی پر چھوڑ دی ہیں، اور اس اسوہ کو اس حد تک وسعت دی ہے کہ پیغمبروں کے خواب تک کو وحی الٰہی اور حکم الٰہی کا درجہ دے رکھا ہے۔ اور جگہ بہ جگہ ایسی وحی کے حوالے دئے ہیں جن کا قرآن میں کہیں نام و نشان تک نہیں تو خود اس قرآن کے بارے میں کیا ارشاد ہو گا؟ حدیث سے پہلے آپ کی اس پھبتی کی زد تو خود قرآن ہی پر پڑ رہی ہے۔ اگر آپ اسے ماننے کیلئے تیار نہیں تو آئندہ اس اجمال کی تفصیل بھی پیش کر سکتا ہوں۔

ان گنت راویوں پر ایمان لانے کا معاملہ:

آپ نے یہ بھی سوال اٹھایا ہے کہ قرآن پر ایمان لانے کیلئے رسول کی رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے۔ پس اسی طرح روایتوں کو حدیث رسول ماننے کیلئے تمام راویوں پر ایمان لانا ضروری ہو گا۔ تو کیا ہمیں اللہ اور رسول کی طرف سے ان گنت راویوں پر ایمان لانے کی تکلیف دی گئی ہے؟

اولا: میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے؟ اور حضور پر قرآن کے نزول کا بذات خود مشاہدہ کیا ہے؟ نہیں اور یقینا نہیں۔ بلکہ آپ تو چودھویں صدی میں پیدا ہوئے ہیں۔ اب آپ بتائیے کہ آپکو اس بات کا علم کیسے ہوا کہ

حضور پیغمبر تھے؟ اور آپ پر یہی قرآن نازل ہوا تھا جو اس وقت ہمارے ہاں متداول ہے؟

اپ یہی کہیں گے کہ اس امت کے اجتماعی نقل و تواتر سے یہ قرآن ہم تک پہنچا ہے اس لئے ہم اس کی صحت کا یقین رکھتے ہیں۔

حجيّة الحديث

(باللغة الأردية)

تأليف

فضيلة الشيخ صفي الرحمن المباركفوري رحمه الله

مراجعة

شفيق الرحمن ضياء الله المدني

الناشر

المكتب التعاوني للدعوة والإرشاد وتوعية الجاليات بالربوة

الرياض – المملكة العربية السعودية